© rasailojaraid.com

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

علم اور عشق

انسانی زندگی کی دو بنیادی قدریں

ہر شخص کسی نہ کسی یقین یا عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن اگر یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ اس یقین کی معین الفاظ میں وضاحت کرے تو وہ کچھ سوچ بچار میں پڑ جاتا ہے۔ عام طور پہ ہر انسان کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہوتا ہے اور وہ جماعت خواہ کوئی قبیلہ ہو، خواہ کوئی وسیع تر ملت ہو، ہر شخص کی پیدائش سے مدتوں پہلے کچھ عقائد متعین کر چکی ہوتی ہے۔ جن والدین کی وساطت سے ایک فرد زندگی میں داخل ہوتا ہے وہ تازہ وارد مولود سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے اور ان کی ملت کے عقائد کو صداقتِ مطلقہ سمجھ کر بے چون و چرا قبول کر لے گا اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالے گا۔ عام انسانوں کا یہی حال ہے کہ جب عقائد کے متعلق ان سے سوال کیا جائے تو وہ انہی عقائد کو دہرا دیں گے جن کی تلقین والدین نے بچے کے ابتدائے شعور ہی سے کر دی تھی۔ عقائد بہت جلد ہی تحت الشعور میں داخل ہو کر استدلال اور عام تجربۂ حیات سے بے نیاز ہو کر اٹل ہو جاتے ہیں اور لاکھوں انسانوں میں مشکل سے کوئی ایک فرد ہی ایسا ملے گا جو ان عقائد کی گرفت سے نکل گیا ہو اور جس نے آزادانہ طور پر اپنے تجربۂ حیات سے یا اپنی عقل اور فہم سے زندگی کی نسبت کوئی ایسا عقیدہ قائم کیا ہو جو والدین یا ملت سے اخذ کردہ عقائد سے جداگانہ یا ان کے منافی ہو۔ مرزا غالب آزاد خیالی کے مدعی تھے۔ چنانچہ ایک فارسی شعر میں اپنے والد سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ قبلہ میری تبدیلیٔ عقیدہ کی وجہ سے مجھ کو سرزنش نہ کیجیے۔ جو شخص بھی صاحبِ نظر یا دیدہ ور ہوتا ہے وہ اپنے بزرگوں کے دین پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور مثال میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بُت پرست باپ آذر کو پیش کرتے ہیں:

با من میاویز اے پدر، فرزندِ آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگان خوش نہ کرد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میرے لیے اس کا اندازہ کرنا دشوار ہے کہ میں فطرت کے فیض یا اپنی کوششوں سے کہاں تک یہ دوری پیدا کر سکا۔

میں نے ملّتِ اسلامیہ میں جنم لیا اور ایسے والدین کے ہاں پیدا ہوا جو نہ صرف مسلمان تھے بلکہ مسلمانوں میں غیر مقلد اور موحّد کہلاتے تھے۔ اور موحّد کے یہ معنی تھے کہ وہ شریعت اور فقہ کے معاملے میں کسی ایک امام کی پیروی کو لازمی نہ سمجھتے تھے اور موحّد کے یہ معنی تھے کہ وہ خدا کی وحدت، اس کی قدرت اور اس کی مشیت میں کسی کو شریک نہ گردانتے تھے۔ اور اس کے قائل تھے کہ دعا اور اعمالِ صالحہ کے وسیلے سے ہر انسان براہِ راست اس خدا سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے جو سمیع و بصیر اور علیم ہے اور انسان کی شہ رگ سے قریب تر ہے۔ میرے خانگی ماحول میں نہ کسی قسم کی بُت پرستی تھی نہ توہم پرستی، نہ قبر پرستی نہ اسلاف پرستی۔ بس ادھر انسان تھا اور ادھر ایک خدائے واحد۔ حُسنِ اتفاق سمجھیے یا خوبیٔ تقدیر، میرے والد کا نام عبدالرحمان تھا اور میری والدہ کا نام رحیم بی بی۔ میں کسی قدر خوش بیانی کے انداز میں اپنے احباب سے اکثر فخر سے کہتا ہوں کہ بھائی میں رحمان اور رحیم کی اولاد ہوں اس لیے رحمت کا جذبہ اور میلان مجھے ورثے میں ملا ہے۔ میرے والد نے میرا نام عبدالحکیم رکھا تاکہ مجھے رحمت کے ساتھ ساتھ حکمت بھی ودیعت ہو۔ چونکہ میرے گھر میں عقائد کے متعلق کوئی تشدد نہ تھا اس لیے میں ابتدا ہی سے آزادانہ طور پر سوچنے کا عادی ہو گیا۔ میری تمام عمر طالب علمی میں گزری ہے اور صبح سے شام تک رب زدنی علماً کا وِرد کرتا رہتا ہوں۔ علوم و فنون کی ہزاروں کتابیں ہضم کر گیا۔ لیکن معلومات کی ترقی کے ساتھ ساتھ جہالت کا احساس بھی بڑھتا جاتا ہے:

کاملے گفت است می باید بسے
عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و قیاس
تا شود خاموش یک حکمت شناس

میں ابھی تک حقائقِ حیات کو ٹٹولتا رہتا ہوں اور میری حالت علامہ اقبالؔ کے اس اقرار کے مطابق ہے:

قیودِ شام و سحر میں بسر تو کی لیکن
نظامِ کہنۂ عالم سے آشنا نہ ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ میں کامل تشکیک اور بے یقینی کا شکار ہوں کیونکہ کامل بے یقینی تو روحانی موت ہے اور میں روحانی لحاظ سے اپنے آپ کو مُردہ نہیں سمجھتا۔

فلسفے کی تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس میں میں نے ہر قسم کی تشکیک اور الحاد میں غوطہ زنی کی ہے لیکن بفضلِ ایزدی غرق نہیں ہوا۔ فلسفے نے بھی بحیثیتِ مجموعی میرے اس عقیدے کو تقویت بخشی کہ خدا کی نسبت عقیدۂ توحید تمام عقائد کا سرچشمہ ہے اور دل اور عقل دونوں کے لیے دیگر عقاید کی نسبت زیادہ تشفّی بخش ہے۔ کمال درجے کی آزاد خیالی کے باوجود جس دین میں میں پیدا ہوا اس کے اساسی حقائق سے میں باہر نہ جا سکا۔ اگرچہ ان کی تاویل میں میرے ہم خیال ابھی تھوڑے ہی ہیں۔

کچھ طبیعت کے میلان سے، کچھ مطالعے سے، کچھ تجربۂ زندگی سے، اور کچھ اس گھرانے اور اس ملّت کی بدولت جس میں میں پیدا ہوا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انسانی زندگی کی دو بنیادی اقدار ہیں۔ علم اور عشق۔ میرے مذہبی صحیفے نے بھی اس کی تصدیق کی کہ آدمی علم کی بدولت مسجودِ ملائک یا بالفاظِ دیگر کائنات کی تمام قوتوں کا مسخر بن سکتا ہے اور خدا کی رحمت جو تمام حیات و کائنات پر حاوی ہے، انسان کا اس سے بہرہ اندوز ہونا عین دین ہے۔ رحمت طلبی اور رحمت ورزی ہی کا دوسرا نام محبّت ہے، یا عشق ہے۔ سچا دین میرے نزدیک وہی ہے جو انسان سے معرفت اور افزونیِ محبت کا تقاضا کرے۔ علم و عشق کے صحیح توازن اور ان کی صالحانہ آمیزش سے اکسیرِ حیات تیار ہوتی ہے۔ نہ علم کی کوئی انتہا ہے نہ عشق کی۔ اس لیے انسانی زندگی کی ترقی اور اس کے ممکنات کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ یہی راستہ خودی کی استواری کا ہے اور یہی وہ جادۂ ارتقا ہے جس کی منزلِ مقصود خدا ہے جو مبدءِ حیات بھی ہے اور مقصدِ حیات بھی۔ ھوالاوّل۔ ھوالآخر۔ ھوالظاھر۔ ھوالباطن۔ میں اس عقیدے کو دین بھی سمجھتا ہوں اور حکمتِ بالغہ بھی۔ جب نوعِ انسانی اس عقیدے کو راسخ کر کے اس پر زندگی کو ڈھالے گی تو جہالت اور ظلم دونوں ناپید ہو جائیں گے۔ انسان علم اور عشق کا امین ہے۔ اس امانت میں خیانت سے وہ ظلوماً جھولا بن جاتا ہے۔ اور امین ہونے سے اس کی زندگی سعادت اندوز اور اس کی تقویم احسن ہو جاتی ہے۔

(بشکریہ شیخ غلام علی اینڈ سنز و فرینکلن فاؤنڈیشن)

© rasailojaraid.com